بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

جدید چین کے بانی چیئرمین ماؤزے تنگ بالآخر ایک طویل سپاہیانہ اور باوقار انقلابی زندگی بسر کرنے کے بعد دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ماؤزے تنگ کا شمار بیسویں صدی کے ان فکری اور انقلابی رہنماؤں میں ہوتا ہے جنہوں نے نہ صرف اپنے ملک کے کروڑوں انسانوں کو نئی زندگی دی بلکہ عالمی برادری کے دل و دماغ پر بھی گہرے نقش چھوڑے۔ ماؤ نے اپنے فلسفۂ حیات کو بروئے کار لانے کے لیے جس محنت، استقامت، ولولہ، اخلاص اور صبر و تحمل سے کام کیا، اس نے چینی قوم کے سامنے فکر و عمل کی نئی راہیں کھول دیں جن پر چل کر کروڑوں انسانوں نے اپنے دامن سے سستی و کاہلی، کام چوری و نامرادی کے ہر داغِ ذلت کو دھو دیا۔ ماؤ نے اپنے فکر و عمل اور طرزِ زندگی سے قوموں کو زندہ رہنے کا ڈھنگ سکھایا اور صحرائے حیات میں گم کردہ راہ قوموں کو بتایا کہ بلند نصب العین سے تہی دامنی اور جذبۂ عمل سے محرومی کا نام موت ہے۔ ماؤ کی کامیاب زندگی کو دیکھنے کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ماؤ کو یہ مرتبہ بلند کیسے ملا؟ کیونکہ بیسویں صدی نے اور بھی بڑے بڑے مدبر، سیاستدان، انقلابی اور فوجی ماہرین کو جنم دیا، جنہوں نے اپنی قومی تاریخ میں نمایاں کردار ادا کیا لیکن ان میں سے کوئی بھی ماؤزے تنگ کے مقام کو نہ پاسکا۔ ہماری رائے میں اس کی ایک بڑی وجہ ماؤ کا حسنِ عمل ہے جس نے ماؤ کو بڑا بنایا۔ بے شبہ دنیا میں سچائی کا اعتراف

بڑی بات ہے لیکن سچائی کے سانچے میں ڈھل جانا اس سے بھی بڑی بات ہے، اس پاکیزہ عمل کو اسلام نے ایمان اور عمل سے تعبیر کیا ہے۔ ماؤ نے جو کچھ کہا اس پر خود عمل کیا۔ مکر و فریب اور نفاق و تملق کو پاس پھٹکنے نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ چین نے روس کی کمیونسٹ پارٹی کے پیغامِ تعزیت کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ چین کا "اہلِ بدعت" سے کوئی رشتہ نہیں۔

ماؤ کی اصول پرستی اور سیاسی بصیرت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ جب پاکستان ۱۹۵۵ء میں مغربی ملکوں کے حلیف کی حیثیت سے نہ صرف غیر جانب دار ملکوں بلکہ عربوں کی نگاہ میں بھی معتوب تھا اور بھارتی فضا چینی ہندوستانی بھائی بھائی کے نعروں سے گونج رہی تھی، ایسے وقت میں بھی چین نے کشمیر کو بھارت کا حصہ قرار نہیں دیا۔ ماؤ کی یہی اصول پرستی، صاف گوئی، نصب العین سے عشق اور حسنِ عمل ہے جس نے اسے سیاسی دنیا میں ایک نمایاں مقام عطا کیا ہے۔

ماؤ کی زندگی سے ہم اہلِ پاکستان بھی سبق لے سکتے ہیں کیونکہ ہم خود اپنا ایک فلسفۂ حیات رکھتے ہیں، جو یہ کہتا ہے کہ آسمان سے رشتہ قائم کئے بغیر انسانی روح کو کبھی قرار نہیں آئے گا۔ یہ فلسفۂ حیات قرآن مجید کی شکل میں ہمارے پاس محفوظ ہے اور تاریخ کے ایک دور میں اس فلسفۂ حیات کی بنیادوں پر کامیاب تجربہ بھی ہو چکا ہے۔ اس تجربہ کو ہم دوبارہ اپنے حسنِ عمل ہی سے دہرا سکتے ہیں۔ لیکن اس حسنِ عمل کا سراغ پانے کے لیے ہمیں انفرادی اور اجتماعی طور پر خود اپنا محاسبہ کرنا ہو گا کہ ہم جس سچائی کے نام لیوا ہیں کیا اس سچائی کا کوئی تعلق ہماری زندگی سے ہے؟

جہیز بل

برصغیر کا مسلم معاشرہ جن سماجی ناانصافیوں سے دوچار رہا ہے اس کی داستان بڑی ہی دردناک ہے۔ ان اجتماعی ناانصافیوں کی ذمہ داری کم و بیش خود ہمارے اپنے اجتماعی نظام پر عاید ہوتی ہے، جس میں جھوٹے رسم و رواج اور جذبۂ نام و نمود کو مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ ان سماجی مسائل میں سے ایک سب سے بڑا مسئلہ جہیز کا ہے جس نے ہماری سینکڑوں بہنوں کی زندگیوں کو تاراج کیا ہے کیونکہ سرمایہ دارانہ معاشرے میں غریب کی غربت سب سے بڑا جرم شمار ہوتی ہے۔ ہماری بہنوں کی بے کسی اور حرماں نصیبی پر پتھروں کے دل چھوٹ پھوٹ گئے لیکن ہمارا سماجی نظام ٹس سے مس نہیں ہوا۔

مقامِ مسرت ہے کہ پاکستان کی قومی اسمبلی نے اس سلسلہ میں جہیز بل کے نام سے ایک قانون پاس کر دیا ہے جس کو تیار کرنے میں ہماری وزارتِ امورِ مذہبیہ اور اس کے سربراہ نے بڑی تندہی سے کام کیا ہے۔ اس قانون میں ہمارے سماج

کے شریف خاندانوں کی عزت و آبرو کو بچانے کے لیے جذبۂ نام و نمود پر پابندی عاید کی گئی ہے۔ سماجی برائیوں کی روک تھام کے لیے قومی حکومت قانون بناتی ہے اور اسے ہر ممکن طریق سے لاگو بھی کرتی ہے لیکن قانون کو صحیح طور پر کامیاب بنانے کے لیے عوام اور معاشرے کے ہر گروہ کا تعاون ضروری ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ حکومت نے جس پاکیزہ جذبہ سے سرشار ہو کر یہ قانون بنایا ہے اس کے پیشِ نظر ہمارے دانش ور، علمار کرام اصحاب اور عوام اسے کامیاب بنانے میں ہر ممکن کوشش سے کام لیں گے۔

مفتی محمد شفیع

فکر و نظر کا یہ پرچہ پریس میں جا چکا تھا کہ ہمیں مفتی محمد شفیع صاحب کے انتقال کی افسوسناک خبر ملی۔ مفتی محمد شفیع برصغیر کے ان مخلص علمار میں سے تھے جنہوں نے اخلاص کے ساتھ تحریک پاکستان کی حمایت کی۔ اور اس تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے ۱۹۴۶ء میں دارالعلوم دیوبند سے استعفیٰ دیا اور کراچی سے لے کر کلکتہ تک کے مسلمانوں کو مسلم ریاست کے قیام کے لیے آمادہ کیا۔ مفتی صاحب علمی آدمی تھے۔ لیکن انھوں نے برصغیر کے معروف روحانی رہنما مولانا اشرف علی تھانوی کے ایما پر مسلم لیگ سے رشتہ جوڑا، پاکستان بن جانے کے بعد آپ نے ۱۹۴۸ء میں مولانا شبیر احمد عثمانی کے مشورے پر اپنے محبوب شہر دیوبند کو چھوڑ کر کراچی میں قیام کیا۔ دیوبند اور دارالعلوم کو چھوڑنا مفتی صاحب کے لیے انتہائی تکلیف دہ تھا۔ لیکن یہ مسلم ریاست کا حسین تصور تھا جس کی خاطر انھوں نے دیوبند اور اہلِ دیوبند سے دست بردار ہونا قبول کیا۔ مسلم لیگ سے وابستہ ہونے کی وجہ سے مفتی صاحب کا مسلم معاشرے اور اس کے اجتماعی مسائل سے گہرا تعلق رہا اور وہ اس کی مشکلات پر قابو پانے کے لیے اسلامی نقطۂ نظر سے غور و فکر بھی کرتے رہے، ان کی کتاب "ہندوستان میں اسلام کا نظامِ اراضی" اس غور و فکر کے نتیجہ میں ہمارے سامنے آئی۔ اور "احکام القرآن" جسے انھوں نے اپنے مرشد کے حکم سے ترتیب دیا، کی تالیف میں بھی عہدِ حاضر کا مسلم معاشرہ پیشِ نظر تھا۔ مفتی صاحب نے قرآن مجید کی تفسیر "معارف القرآن" کے نام سے لکھی۔ معارف القرآن کی تالیف یوں عمل میں آئی کہ مفتی صاحب نے ۱۹۵۴ء میں ریڈیو پاکستان کی درخواست پر ریڈیو سے قرآن مجید کا درس شروع کیا اور علمار ربانی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اس درس کا معاوضہ قبول نہیں کیا۔ یہی درس بعد میں "معارف القرآن" کے نام سے پبلک کے سامنے آئے۔ یہی وجہ ہے کہ اس تفسیر میں انھوں نے عوام کے اخلاقی اور دینی مفاد کو پیشِ نظر رکھا اور عقاید کی پیچیدہ بحثوں سے اجتناب کیا۔ مفتی صاحب کی تحریروں پر مفصل تبصرہ حالیہ اشاعت

میں ممکن نہیں۔

مفتی صاحبؒ کو حنفی فقہ پر بڑا عبور حاصل تھا، اس لیے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ مولانا شبیر احمد عثمانی کی وفات کے بعد مفتی صاحب دوسرے ممتاز عالم دین ہیں جن کی وفات کو اسلامیات کے طالب علم بہت عرصے تک شدت کے ساتھ محسوس کرتے رہیں گے۔ ہمیں مفتی صاحب کے پسماندگان سے دلی ہمدردی ہے اور خدا سے دعا گو ہیں کہ وہ مفتی صاحب کی دینی اور علمی خدمات کو قبول فرمائے۔